8

# جماعت احمدیہ لاہور سے خطاب

## اللہ تعالیٰ نے تمہیں اوّلیّت کا جو مقام دیا تھا اُسے دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کرو

(فرمودہ 19فروری1954ء بمقام رتن باغ لاہور)

تشہّد، تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:

''ہماری جماعت کے دوستوں کو یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ احمدیت کو قائم ہوئے ایک لمبا زمانہ گزر چکا ہے۔ اگر براہین احمدیہ سے اس زمانہ کو لیا جائے تو 70، 71 سال ہو گئے ہیں اور اگر بیعت کے آغاز سے اس زمانہ کو شمار کیا جائے تو پھر 65 سال ہو گئے ہیں اور یہ ایک بہت بڑا وقت ہے۔ اور گو قوموں کی عمر کے لحاظ سے اتنے سال کوئی زیادہ لمبا زمانہ نہیں سمجھے جاسکتے لیکن انسانوں کی عمر میں یہ ایک بہت بڑا وقت ہے۔ اس تمام عرصہ میں ابتدائی زمانہ سے ہی لاہور کا ایک حصہ احمدیت کے ساتھ شامل رہا ہے۔ ہم چھوٹے ہوتے تھے جب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ سفروں میں ہم آتے جاتے تھے۔ اُس وقت عموماً جب آپ کو رستہ میں ٹھہرنا پڑتا تو لاہور یا امرتسر میں ہی ٹھہرتے۔ یوں ابتدائی زمانہ میں آپ کا قیام زیادہ تر لدھیانہ میں رہا ہے لیکن جماعت کے لحاظ سے لاہور کی جماعت ہمیشہ زیادہ رہی ہے اور دوسری جماعتوں کی نسبت زیادہ مستعد رہی ہے۔ چونکہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے والد صاحب کے زمانہ میں مقدمات کے لیے اکثر لاہور آتے تھے اور آپ کے

والد صاحب کے تعلقات بھی زیادہ تر لاہور کے رؤساء سے تھے۔ اس لیے ابتدائی ایام میں ہی یہاں ایک ایسی جماعت پائی جاتی تھی جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے اخلاص رکھتی تھی۔ الٰہی بخش صاحب اکاؤنٹینٹ جو بعد میں شدید مخالف ہو گئے وہ بھی یہیں کے تھے۔ مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی جو بعد میں تکفیر کا فتوی لگانے والوں کے سردار بنے وہ بھی یہیں چینیاں والی مسجد کے امام تھے اور ان کا زیادہ تر اَثر اور رسوخ لاہور میں ہی تھا۔ گو وہ رہنے والے بٹالہ کے تھے۔ اِسی طرح میاں چراغ الدین صاحب، میاں معراج الدین صاحب اور میاں تاج الدین صاحب کے، حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے بہت پُرانے تعلقات تھے۔ میاں چراغ الدین صاحب اور میاں معراج الدین صاحب کا خاندان اپنے پرانے تعلقات کے لحاظ سے جو بیعت سے بھی پہلے کے تھے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نگاہ میں بہت قُرب رکھتا تھا۔ پھر حکیم محمد حسین صاحب قریشی جنہوں نے دہلی دروازہ والی مسجد بنوائی اُن کے تعلقات بھی حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے بہت قدیم اور مخلصانہ تھے۔ میاں چراغ الدین صاحب مرحوم کے تعلقات تو الٰہی بخش اکاؤنٹینٹ سے بھی پہلے کے تھے۔ حتّٰی کہ میرے عقیقہ میں جن دوستوں کو شامل ہونے کی دعوت دی گئی تھی اُن میں میاں چراغ الدین صاحب بھی تھے۔ اتفاقاً اُس دن سخت بارش ہوگئی۔ وہ سناتے تھے کہ ہم باغ تک پہنچے مگر آگے پانی ہونے کی وجہ سے نہ جا سکے اور وہیں سے ہمیں واپس لوٹنا پڑا۔ پس اِس جگہ کی جماعت کی بنیاد ایسے لوگوں سے پڑی ہے جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے اُس وقت سے اخلاص رکھتے تھے جب آپ نے ابھی دعوٰی بھی نہیں کیا تھا اور براہین لکھی جا رہی تھی۔ پھر خدا تعالیٰ نے ان کے خاندانوں کو ترقی دی اور وہ اخلاص میں بڑھتے چلے گئے۔ میاں چراغ الدین صاحب اور میاں معراج الدین صاحب کے خاندان کے اس وقت درجنوں آدمی ہیں اور ان میں سے بہت سے لاہور میں ہی ہیں۔ میاں مظفرالدین صاحب جو پشاور کی جماعت کے امیر تھے وہ میاں تاج الدین صاحب کے بیٹے تھے۔ اِسی طرح اَور کئی پرانے خاندانوں کی اولادیں یہیں ہیں مگر افسوس ہے کہ اگلی نسل میں اب وہ پہلی سی بات نہیں رہی۔ ان میں کچھ تو مخلص ہیں اور کچھ کمزور ہو گئے ہیں۔ جو لوگ مخلص ہیں اُن میں کچھ تو ایسے ہیں جو خواہش رکھتے ہیں کہ

اپنے آپ کو روشناس کراتے رہیں اور کچھ مخلص تو ہیں لیکن یہ احساس اُن کے دلوں سے مِٹ گیا ہے کہ سلسلہ کے ساتھ ان کا اہم تعلق ہے۔ وہ اپنی جگہ پر مخلص ہیں مگر اپنے آپ کو آگے لانے اور روشناس کرانے میں کوتاہی کرتے ہیں۔ حالانکہ کسی جماعت کے بنیادی لوگوں میں سے ہونا بڑے فخر کی بات ہوتی ہے۔ جہاں یہ بات بُری ہوتی ہے کہ انسان جماعت کے متعلق یہ خیال کرے کہ وہ میری چراگاہ ہے اور اس سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرے وہاں یہ بات بھی بُری ہوتی ہے کہ کوئی شخص ایک سچی جماعت کے ابتدائی لوگوں میں سے ہو اور پھر وہ اس پر فخر محسوس نہ کرے۔ اِس کے معنے یہ ہیں کہ اس چیز کی قدر اُس کے دل میں نہیں ورنہ جن لوگوں کے دلوں میں قدر ہوتی ہے جہاں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر انہوں نے کچھ کام کیا ہے تو سلسلہ پر احسان نہیں کیا بلکہ سلسلہ نے اُن پر احسان کیا ہے وہاں وہ اپنی اہمیت کو بھی خوب سمجھتے ہیں۔

تاریخوں میں لکھا ہے کہ جب حضرت معاویہؓ نے دیکھا کہ اُن کی وفات قریب ہے تو وہ مدینہ میں آئے اور اپنے بڑے بیٹے یزید کو بھی اپنے ساتھ لائے۔ پھر انہوں نے مسجد میں سب لوگوں کو جمع کیا اور کہا اے لوگو! میں سمجھتا ہوں کہ جس قسم کے حقوق ہمارے خاندان کو حاصل ہیں اور جس قسم کی قابلیت میرے اس بیٹے میں پائی جاتی ہے اس کو مدنظر رکھتے ہوئے یہی اِس بات کا مستحق ہے کہ آئندہ اسے جانشین مقرر کیا جائے۔ اس کے باپ کو جو مقام حاصل ہے، وہ اَور کسی کو حاصل نہیں۔ اور خود اس کے اندر جو قابلیت پائی جاتی ہے وہ بھی کسی اَور میں نہیں پائی جاتی۔ اس لیے یہ دونوں باتیں اِس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ آئندہ اسے ہی حکومت کے تخت پر بٹھایا جائے[1]۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ اُس وقت میں بھی مسجد کے ایک سرے پر بیٹھا ہوا تھا اور میں نے چدّر کو اپنے گھٹنوں کے اردگرد لپیٹا ہوا تھا (زمینداروں میں جو چودھری ہوتے ہیں اُن میں بھی آجکل یہ طریق رائج ہے۔ چونکہ انہیں سہارا لے کر بیٹھنے کی عادت ہوتی ہے اس لیے جب وہ بیٹھتے ہیں تو گھٹنوں کے اردگرد کپڑا باندھ کر اسے گرہ دے دیتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ میں بھی اسی طرح بیٹھا ہوا تھا)۔ جب معاویہ نے یہ کہا تو میرے دل میں خیال آیا کہ معاویہ کی کیا حیثیت ہے میرے

باپ کے مقابلہ میں، اور یزید کی کیا حیثیت ہے میرے مقابلہ میں۔ ہم نے ابتدائے اسلام میں کام کیا ہے جبکہ یہ لوگ اسلام کے مخالف تھے۔ پس یہ کون ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو ہم سے بہتر قرار دیں۔ چنانچہ میں نے اپنا کپڑا کھولا اور یہ کہنا چاہا کہ یہاں وہ لوگ موجود ہیں جن کے باپ کی حیثیت یزید کے باپ کی حیثیت سے بہت بلند ہے اور یہاں وہ لوگ بھی موجود ہیں جو اسلام کے لیے قربانی اور اس کی خدمت میں یزید سے بہت آگے ہیں مگر پھر میں بیٹھ گیا اور میں نے اپنے دل میں کہا یہ محض ایک دنیوی چیز کے لیے آگے آ رہے ہیں میں اس میں کیوں دخل دوں؟

اب دیکھو! اِس میں دونوں باتیں آ گئیں۔ اُن کا احساسِ غیرت بھی ثابت ہو گیا اور پتا لگ گیا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ محسوس کرتے تھے کہ اُن کے خاندان کو خداتعالیٰ نے وہ فضیلت دی ہے جو معاویہ اور اُس کے خاندان کو حاصل نہیں۔ لیکن دوسری طرف انہوں نے یہ بھی ظاہر کر دیا کہ ہم اس اہمیت کے ذریعہ سے کوئی دنیوی فائدہ نہیں اُٹھانا چاہتے۔ پس ہمیں کسی کے لیے ٹھوکر بننے کی کیا ضرورت ہے۔ غرض ایک ہی وقت میں وہ خدمتِ دین کا موقع ملنے پر فخر کرتے ہیں اور اُس وقت اُن کے اندر یہ احساس بھی پایا جاتا تھا کہ اِس کے بدلہ میں ہم نے لوگوں پر حکومت نہیں کرنی اور یہی اصل روح ہوتی ہے۔

پھر بعض لوگوں کو ہم نے دیکھا ہے کہ گو ان کے تعلقات پرانے نہیں ہوتے لیکن جوشِ محبت میں وہ اپنے آپ کو آگے لے آتے ہیں اور وہ اپنے تعلقات کو ایسے رنگ میں ظاہر کرتے ہیں کہ گویا اُن کو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ میں کوئی بہت بڑی پوزیشن حاصل تھی۔ اُس وقت یہ نظارہ دیکھ کر ہمیں کم از کم اتنا لطف ضرور آ جاتا ہے کہ ان کو اس تعلق کی قیمت کا کتنا احساس ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ جن کی کتابوں میں بڑی کثرت کے ساتھ احادیث پائی جاتی ہیں وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے قریب مسلمان ہوئے تھے۔ اُن سے بہت زیادہ موقع رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں بیٹھنے کا کئی دوسرے صحابہؓ کو ملا تھا مگر وہ اپنے عشق اور محبت میں یہ جتانے کے لیے کہ گویا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ان کو کوئی بہت بڑی پوزیشن حاصل تھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد

جب آپؐ کا ذکر کرتے تو کہا کرتے تھے میرے خلیل نے یوں کہا، میرے خلیل نے یوں کہا۔2 حالانکہ عربی زبان کے لحاظ سے خلیل اسے کہتے ہیں جس کا عشق اتنا سرایت کر جائے کہ جسم کے مساموں میں داخل ہو جائے اور یہ مقام بہت بڑا ہے مگر حضرت ابوہریرہؓ اپنی محبت کے جوش میں یہ بتانے کے لیے کہ گویا ان کا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑا پرانا تعلق تھا کہا کرتے تھے میرے خلیل نے یوں کہا، میرے خلیل نے یوں کہا۔ ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے انہیں یہ الفاظ کہتے سُن لیا تو انہیں بُرا معلوم ہوا اور انہوں نے ڈانٹا کہ تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟ کیا ہمیں معلوم نہیں کہ تمہارا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کتنا تعلق تھا؟ حضرت ابوہریرہؓ ڈر گئے اور انہوں نے کہا میں تو محبت کے جوش میں یہ کہہ رہا ہوں۔3 اب دیکھو! رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو فرماتے ہیں کہ اگر خدا تعالیٰ کے سوا میں کسی اَور کو خلیل بنا سکتا تو ابوبکر کو بناتا۔4

گویا ''خلیل'' کا لفظ ابوہریرہؓ کے لیے چھوڑ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کے لیے بھی استعمال نہیں فرمایا، حضرت عثمانؓ کے لیے بھی استعمال نہیں فرمایا، حضرت علیؓ کے لیے بھی استعمال نہیں فرمایا لیکن ابوہریرہؓ اپنے تعلق کے اظہار کے لیے جب کوئی روایت کرتے تو بعض دفعہ یہ نہ کہتے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا ہے بلکہ فرماتے میرے خلیل نے ایسا کہا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے انہیں ڈانٹا کہ خبردار! جو آئندہ یہ الفاظ استعمال کیے۔

پس جن لوگوں کے اندر جوش ہوتا ہے خواہ انہیں کوئی بھی پوزیشن حاصل نہ رہ چکی ہو، وہ اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ خواہ وہ کتنی بڑی پوزیشن رکھتے ہوں اُن کے اندر اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی خواہش نہیں ہوتی۔ صحابہؓ جب کہیں باہر جاتے تھے تو گو مسئلہ یہی ہے کہ جو امام ہو اُسی کو نماز پڑھانی چاہیے سوائے خلیفۂ وقت کے کہ وہ جہاں جائے گا وہی امام ہو گا، پھر بھی بعض لوگ ان کی بزرگی اور اخلاص کی وجہ سے انہیں نماز پڑھانے کے لیے کہہ دیتے تھے۔ اِس پر بعض صحابہؓ انکار کر دیتے مگر بعض دفعہ وہ لوگوں کے اصرار پر پڑھا بھی دیتے کیونکہ بعض دفعہ دوسرے کا اصرار اتنا بڑھ جاتا ہے کہ انسان سمجھتا ہے اب اگر میں نے انکار کیا تو اس کی دل شکنی ہو گی۔

غرض لاہور کی جماعت کے اندر ایسے لوگ موجود ہیں جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ابتدائی زمانہ میں آپ پر ایمان لائے۔ اور اگر وہ نہیں تو ان کے رشتہ دار ایسے موجود ہیں جو صحابی ہیں خواہ وہ ایسے مقام پر نہیں کہ دعویٰ سے پہلے انہوں نے آپ کی مدد کی ہو مگر وہ ایسے مقام پر ضرور ہیں کہ وہ اُس وقت ہوش والے تھے اور عقل والے تھے جب انہوں نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو قبول کیا۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ ان لوگوں کے خاندانوں میں اب وہ جوش نہیں رہا جو پہلے ہوا کرتا تھا۔ بعض میں تو کمزوری پیدا ہو گئی ہے اور بعض اپنے آپ کو نمایاں کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ شاید ان کے دلوں میں یہ خیال ہو کہ ہمیں آگے آنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے بتایا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے بھی آگے آنے سے انکار کیا تھا مگر انہوں نے کہا یہی، کہ حق ہمارا ہے۔ گویا یہ تو انہوں نے کہا کہ ہم حکومت نہیں لیتے لیکن جو فضیلت اور بزرگی اُن کو حاصل تھی اُس سے انہوں نے انکار نہیں کیا۔ اگر ایسے لوگ اپنے آپ کو آگے کریں تو یقیناً دوسروں میں بھی یہ احساس پیدا ہونے لگے گا کہ احمدیت کی خدمت میں انسان خدائی برکات سے حصہ لیتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ یہ احساس ساری جماعت میں پیدا ہو جائے گا۔ جلسہ مذاہبِ عالَم کے لیے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو مضمون لکھا اور جو آجکل ساری دنیا میں پیش کیا جاتا ہے وہ بھی اِس لاہور میں پڑھا گیا تھا۔ اِسی طرح حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے جو آخری پیغام ''پیغامِ صلح'' کے نام سے دیا اور جو اپنے اندر وصیت کا ایک رنگ رکھتا ہے وہ بھی لاہور میں ہی پڑھا گیا۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنے آخری ایامِ زندگی بھی اِسی جگہ گزارے اور پھر یہیں آپ دنیا سے جُدا ہوئے۔ اِس کے بعد جب خلافت کا جھگڑا پیدا ہوا تو مخالفت کا مرکز بھی یہی لاہور بنا اور موافقت کا مرکز بھی لاہور تھا۔ اُس وقت جماعت کی تعداد موجودہ تعداد سے بہت کم تھی۔ باہر سے بھی اگر لوگ آ جاتے تو اُن کو شامل کر کے یہاں کی جماعت اتنی نہیں ہوتی تھی جتنی اِس وقت خطبہ میں بیٹھی ہے۔ مگر اُس وقت اخلاص اور محبت کی یہ کیفیت تھی کہ جب میں لاہور آتا تو سینکڑوں لوگ اردگرد کی جماعتوں کے لاہور میں آ جاتے اور یہاں کا ہر احمدی دوسرے کو اپنا بھائی سمجھتا اور اسے یہ محسوس بھی نہ ہونے دیتا کہ وہ لاہور میں ایک مسافر کی

حیثیت رکھتا ہے لیکن اب وہ کیفیت نظر نہیں آتی۔ اب لوگ مسافروں کی طرح آتے اور چلے جاتے ہیں۔ ان کے متعلق جماعت کے دوستوں میں وہ شوق اور اُنس نہیں رہا جو پہلے پایا جاتا تھا۔ 1919ء، 1920ء اور 1921ء تک یہ کیفیت تھی کہ میرے لاہور آنے پر سیالکوٹ، جہلم، گجرات، شیخوپورہ اور منٹگمری وغیرہ اضلاع کے احمدیوں میں سے اکثر یہاں اکٹھے ہو جاتے اور اُن کا لاہور میں قریباً اُس وقت تک قیام رہتا جب تک میں یہاں موجود رہتا۔ مگر اب جماعت کی تعداد تو زیادہ ہوگئی ہے مگر اِس میں وہ بات نہیں رہی جو پہلے پائی جاتی تھی۔ اِس کی وجہ یہی ہے کہ یہاں کے لوگوں نے اس مقام کی قدروقیمت کو نہیں پہچانا جو انہیں پہلے حاصل تھا۔اگر وہ آنے والوں سے اُسی محبت اور پیار کے ساتھ پیش آتے جس محبت اور پیار سے وہ پہلے پیش آیا کرتے تھے تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ لوگ یہاں کثرت کے ساتھ نہ آتے رہتے۔

میرا تجربہ ہے کہ خداتعالیٰ کے فضل سے ہماری جماعت کے دوستوں میں ایمان کم نہیں ہو رہا بلکہ بڑھ رہا ہے۔صرف کچھ لوگوں میں اپنی ذمہ داری کے احساس میں کمزوری پیدا ہوگئی ہے۔ اگر یہاں کی جماعت اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتی تو یقیناً یہاں پہلے سے بھی زیادہ لوگ آتے۔ بہرحال ابتدائی ایام میں لوگوں نے اپنی ذمہ داری سمجھی اور خداتعالیٰ نے بھی کہا:۔

''لاہور میں ہمارے پاک ممبر موجود ہیں۔ ان کو اطلاع دی جاوے۔ نظیف مٹی کے ہیں وسوسہ نہیں رہے گا مگر مٹی رہے گی''۔4

گویا اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے الہام میں لاہور کے متعلق خبر دی کہ کسی زمانہ میں فتنہ بھی لاہور سے کھڑا ہو گا مگر اس کا تریاق بھی لاہور سے ہی پیدا ہو گا۔ اور جن جماعتوں کو خداتعالیٰ کے دین کی خدمت کی توفیق ملے اور جن کا خدائی پیشگوئیوں میں بھی ذکر آ جائے اُن کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنی اس خصوصیت کو قائم رکھیں اور اِس فخر کو آئندہ کے لیے ہمیشہ نیکیوں میں ترقی کرنے کا ذریعہ بنائیں۔

پھر میں کہتا ہوں اگر باہر سے آنے والوں کو جانے دو اور تم صرف اپنے لوگوں کو ہی سہارا دو تو میرے نزدیک ہر پرانے خاندان میں سے دوچار افراد ایسے ضرور نکل آئیں گے جن میں کچھ کمزوری ہو گی۔ اگر تم ان کی طرف توجہ کرو گے تو یقیناً وہ مخلص بن جائیں گے

اور جماعت اپنے پہلے مقام کو پھر حاصل کر لے گی۔ اِس وقت جماعتوں میں سے کراچی کی جماعت اوّل نمبر پر ہے۔ اُن کی تنظیم زیادہ اچھی ہے، اُن کے عہدیدار زیادہ ہوشیار ہیں اور اُن کی قربانیاں نمایاں ہیں۔ ضرورت پر فوراً اکٹھے ہو جانا اور آپس میں مشورہ کرنا اُن میں لاہور والوں کی نسبت زیادہ پایا جاتا ہے اور یہ چیز ایسی ہے جس میں لاہور کی جماعت کو مسابقت کی روح اپنے اندر پیدا کرنی چاہیے۔ آخر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کراچی نہیں گئے لیکن لاہور میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کئی دفعہ آئے اور آپ نے اپنی عمر کا ایک حصہ یہیں گزارا اور پھر آپ نے 1908ء میں وفات بھی یہیں پائی ہے۔ اِس وجہ سے تمہیں ایک خاص مقام اور اعزاز حاصل ہے۔ مگر تم نے تو خود بخود اپنی مونچھیں نیچی کر لیں۔

حضرت خلیفہ اول سنایا کرتے تھے کہ کوئی پٹھان تھا جو سارا دن بازار میں اور سڑکوں پر تلوار لیے پھرتا رہتا۔ اُس نے بڑی بڑی مونچھیں رکھی ہوئی تھیں اور اُس کا دعوٰی تھا کہ میں سب سے بہادر ہوں اور میرے مقابلہ میں اَور کسی کو مونچھیں رکھنے کا حق نہیں۔ چنانچہ جہاں بھی وہ کسی کی بڑی بڑی مونچھیں دیکھتا تو فوراً تلوار لے کر اُس کے پاس پہنچتا اور کہتا کہ یا تو مونچھ کٹوا دو ورنہ تمہاری گردن اُڑا دوں گا۔ تمہارا کیا حق ہے کہ میرے مقابلہ میں مونچھیں رکھو۔ آخر لوگ سخت تنگ آ گئے۔ ایک ہوشیار آدمی نے جب دیکھا کہ سارے شہر پر آفت آ پڑی ہے تو وہ کام کاج چھوڑ کر گھر میں بیٹھ گیا اور اس نے خوب تیل مَل مَل کر اپنی مونچھیں بڑھانی شروع کر دیں۔ جب مونچھیں خوب پھیل گئیں اور اُس پٹھان کی مونچھوں سے بھی زیادہ شاندار ہو گئیں تو وہ تلوار ہاتھ میں لے کر باہر نکل آیا اور اُس نے وہیں ٹہلنا شروع کر دیا جہاں وہ پٹھان ٹہلا کرتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد خان صاحب آ گئے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ ایک اَور شخص بڑی بڑی مونچھوں والا تلوار لے کر پھر رہا ہے تو وہ غصہ سے اُس کی طرف بڑھے اور پوچھا تم کون ہو؟ اس نے کہا ہم جو ہیں سو ہیں تمہیں اِس سے کیا؟ اُس نے کہا تم نے مونچھیں کیوں بڑھا رکھی ہیں؟ وہ کہنے لگا کیا مونچھیں بڑھانا تمہارے باپ کا حق ہے؟ پٹھان نے کہا ہم نہیں جانتے۔ یا تو تمہیں مونچھیں نیچی کرنی پڑیں گی یا گردن کٹوانی پڑے گی۔ اس نے کہا اگر تمہیں تلوار چلانی آتی ہے تو ہمیں بھی آتی ہے۔ پٹھان کو غصہ تو چڑھا ہی ہوا تھا اُس نے کہا

پھر آؤ اور لڑ لو۔ جب پٹھان کو اُس نے لڑائی کے لیے خوب تیار کر لیا تو وہ کہنے لگا اِس وقت ایک بات میرے ذہن میں آئی ہے اور وہ یہ کہ اگر میں نے تم کو مار لیا یا تم نے مجھے مار لیا تو ہمارے بیوی بچے یتیم رہ جائیں گے۔ اُن کو ہمارے بعد کون پالے گا۔ اِس کا کوئی علاج ہونا چاہیے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ میں یقیناً تمہیں مار لوں گا۔ لیکن میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ تمہارے بیوی بچوں کا اس میں کوئی قصور نہیں۔ پھر تمہارے مرنے کے بعد ان کو کون پالے گا۔ اِسی طرح گو یہ ہونا تو نہیں لیکن فرض کرو میں مارا جاؤں تو میرے بیوی بچوں کو کون پالے گا۔ وہ کہنے لگا بات تو تم نے ٹھیک کہی ہے لیکن اس کا علاج کیا ہے؟ اُس نے کہا علاج یہی ہے کہ تم اپنے بیوی بچوں کو مار آؤ اور میں اپنے بیوی بچوں کو مار آتا ہوں۔ پھر ہماری لڑائی ہو جائے۔ پٹھان نے کہا یہ بات ٹھیک ہے۔ چنانچہ وہ اپنے بیوی بچوں کو قتل کرنے کے لیے چلا گیا۔ یہ اُسی جگہ اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد پٹھان آیا اور اُس نے کہا میں تو اپنے بیوی بچوں کو قتل کر کے آ گیا ہوں۔ اب آؤ اور مجھ سے لڑ لو۔ وہ کہنے لگا میری تو اب صلاح بدل گئی ہے اور میں نے یہی فیصلہ کیا ہے کہ میں اپنی مونچھیں نیچی کر لوں۔ چنانچہ اُس نے اپنی مونچھیں نیچی کر لی تھیں۔

اِسی طرح تم نے بِلا وجہ اپنی مونچھیں نیچی کر لی ہیں۔ حالانکہ مونچھیں نیچی کرنے کی بجائے تمہیں چاہیے تھا کہ تم اپنے اندر یہ احساس پیدا کرتے کہ ہم دینی خدمات میں ہمیشہ اوّل رہے ہیں اور اب بھی اوّل رہیں گے اور اپنے اس مقام کو کبھی ضائع نہیں ہونے دیں گے۔ نوجوانوں کے اندر بڑھنے اور ترقی کرنے کا مادہ ہوتا ہے۔ وہ جہاں اَور باتوں میں اپنی ترقی کے دعوے کیا کرتے ہیں وہاں اُن کا یہ بھی فرض ہوتا ہے کہ وہ روحانی رنگ میں بھی اپنے بزرگوں سے آگے نکلنے کی کوشش کریں اور نمازوں میں اور روزوں میں اور چندوں میں اور قربانیوں میں اور اخلاص میں اور سلسلہ کے لیے فدائیت اور جاں نثاری میں اپنا قدم ہمیشہ آگے کی طرف بڑھائیں۔ میں سمجھتا ہوں اگر اب بھی آپ لوگ توجہ کریں تو اپنے مقام کو دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں ورنہ تھوڑے دنوں کے بعد ممکن ہے کہ اَور بھی کئی جماعتیں تم سے آگے نکل جائیں۔ اور جب بہت سی جماعتیں تم سے آگے نکل گئیں تو پھر اتنا بڑا فاصلہ تم میں اور ان میں

پیدا ہو جائے گا کہ اُس فاصلہ کو پُر کرنا تمہارے لیے مشکل ہو جائے گا۔ پس اپنے اندر بیداری پیدا کرو اور جس طرح دریا میں کشتی پھنستی ہے تو مرد اور عورتیں اور بچے سب مل کر زور لگاتے ہیں کہ کشتی منجدھار سے نکل جائے اُس طرح تم بھی اِس خلا کو پُر کرنے کے لیے اپنا پورا زور صَرف کر دو۔

مجھے یاد ہے ہم ایک دفعہ کشمیر گئے۔ سرینگر کے پاس ایک چھوٹی سی جھیل ہے جو ڈل کہلاتی ہے۔ اُس کے قریب سے ہی دریائے جہلم گزرتا ہے اور دریا میں سے ایک نہر کاٹ کر اُس ڈل کے سامنے سے گزار دی گئی ہے۔ اُس ڈل میں نہر کا دروازہ کھلتا ہے۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ دریا کا پانی اونچا ہو جاتا ہے جس کے نتیجہ میں نہر کا پانی بھی اونچا ہو جاتا ہے اور ڈل میں زور سے پانی گرنے لگ جاتا ہے۔ اُس وقت نیچے سے اوپر کی طرف کشتی لے جانا مشکل ہوتا ہے اور بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ دریا کا پانی نیچا ہو جاتا ہے اور ڈل کا پانی اونچا ہوتا ہے۔ جب دریا اور ڈل کا پانی برابر ہو تب تو کشتیاں آسانی سے اِدھر اُدھر آتی رہتی ہیں۔ لیکن جب ایک طرف کا پانی اونچا نیچا ہو تو پھر کشتی چلانے میں لوگوں کو بڑی دِقّت محسوس ہوتی ہے۔ ایک دفعہ میں نے دیکھا کہ ایک کشتی آئی جس میں بہت سے کشمیری مرد، عورتیں اور بچے بیٹھے ہوئے تھے۔ اُس وقت ایک طرف کا پانی اونچا تھا۔ انہوں نے کشتی چلانے کے لیے بڑا زور لگایا مگر کشتی نہ چلی۔ اس پر کچھ اَور آدمی کشتی سے اُترے اور انہوں نے کشتی کو کھینچنا شروع کیا اور ساتھ ہی زور سے نعرہ لگانا شروع کر دیا لَاإِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ لَاإِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ مگر کشتی نکل نہ سکی۔ جب انہوں نے دیکھا کہ لَاإِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ سے اُن کا کام نہیں بنا تو انہوں نے یا شیخ ہمدانی کا نعرہ لگایا۔ اِس پر لوگوں نے پہلے سے بھی زیادہ زور لگانا شروع کر دیا۔ مگر پھر ایک لہر آئی اور کشتی رُک گئی تو انہوں نے تیسری دفعہ "یا پیرِ دستگیر" کا نعرہ لگایا۔ اِس نعرہ کا لگنا تھا کہ اکثر مرد، عورتیں اور بچے کُود کر کشتی سے نیچے اُتر آئے اور انہوں نے پاگلوں کی طرح زور لگانا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ کشتی نکال کر لے گئے۔ جس طرح انہوں نے پیرِ دستگیر کا نعرہ لگایا تھا اُس طرح قوموں کی زندگی میں بھی کبھی غافلوں کو بیدار کرنے اور جماعت میں ایک نئی قوتِ عمل پیدا کرنے کے لیے نعرہ لگانے کا وقت آ جاتا ہے۔ جب کوئی جماعت اپنے مقام کو ضائع

کر دیتی ہے تو اُس وقت ضرورت ہوتی ہے کہ جس طرح وہ کشمیری مرد، عورتیں اور بچے کشتی سے کُود گئے تھے اور انہوں نے دیوانہ وار زور لگانا شروع کر دیا تھا اُسی طرح وہ بھی زور لگانا شروع کر دیں اور تہیّہ کر لیں کہ خواہ کچھ ہو جائے ہم اپنے مقام کو حاصل کر کے رہیں گے۔

پس اپنی ذمہ داریوں کو سمجھو اور اپنی غفلتوں کو دور کرو۔ خدا نے تمہیں اول بنایا تھا اور وہ چاہتا ہے کہ اب بھی تم اس مقام کو ضائع نہ کرو۔ تم اس بنئے کی طرح اپنی مونچھیں نیچی نہ کرو۔ ممکن ہے اگر تم سچے دل سے کوشش کرو تو تمہارے کمزور بھی مضبوط ہو جائیں، تمہارے نوجوان بھی قربانی کرنے والے بن جائیں اور پھر تمہاری زندگی بالکل بدل جائے اور تم اوّلیّت کے مقام کو دوبارہ حاصل کر لو"۔

"ایک پرانا خاندان جو غیر مبائع ہو چکا ہے اُس کی ایک خاتون مجھ سے ملنے کے لیے آئیں تو ساتھ اُن کے ایک چھوٹی عمر کا نواسہ بھی تھا۔ انہوں نے جو باتیں کیں اُن سے پتا لگتا ہے کہ چاہے وہ ہم سے کتنے ہی دور ہو چکے ہوں پھر بھی وہ سلسلہ سے اپنے تعلقات کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ باتوں باتوں میں پتا لگا کہ اُس بچہ کو درثمین خوب یاد ہے مگر چونکہ اسے درثمین تو پڑھائی گئی اور اِدھر ہم سے قطع تعلق رہا اس لیے بچہ یہ سمجھ ہی نہ سکا کہ اِس درثمین کے اشعار میں جن کا ذکر ہے وہ ہم لوگ ہی ہیں۔ اُس بچے نے ہماری ہمشیرہ مبارکہ بیگم کے متعلق درثمین میں پڑھا تھا ؎

کلام اللہ کو پڑھتی ہے فرفر  خدا کا فضل اور رحمت سراسر 5

مگر چونکہ وہ ہم سے کبھی ملے نہیں تھے اس لیے وہ اپنی نانی کو کہنے لگا میں مبارکہ کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ اب اُن کی عمر 55 سال کی ہو چکی ہے۔ اُن کے بچوں کے بھی آگے بچے بچیاں ہیں۔ وہ انہیں دیکھ کر کہنے لگا کہ حضرت صاحب نے تو لکھا ہے وہ فرفر قرآن پڑھتی ہے اور یہ تو بڑی عمر کی عورت ہیں۔ اِس سے یہ تو پتا لگ گیا کہ اُن کے اندر احمدیت پائی جاتی ہے مگر جدائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے ذہن کے نقشے بدل گئے۔ اس طرح اُس کی نانی بچے کو میرے پاس لائی اور کہا یہ وہ محمود ہیں جن کے متعلق تم شعر پڑھا کرتے ہو کہ

تُو نے یہ دن دکھایا محمود پڑھ کے آیا  دل دیکھ کر یہ احساں تیری ثنائیں گایا 6

وہ کہنے لگا یہ تو بڑی عمر کے لگتے ہیں، وہ تو نہیں لگتے جن کا حضرت صاحب نے ذکر کیا ہے۔غرض ان خاندانوں میں بھی احمدیت سے تعلق کا احساس پایا جاتا ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی پرانی محبت کو تازہ کیا جائے اور اُنہیں اپنے قریب کیا جائے۔

میرا ایک عزیز تھا جو بچپن میں میرے ساتھ بڑی محبت رکھتا تھا۔ جب 1914ء میں اختلاف پیدا ہوا تو وہ غیرمبائع ہو گیا اور سخت مخالفت پر اُتر آیا۔ میں ایک دفعہ باہر گیا تو وہ مجھ سے ملنے کے لیے آ گیا۔ وہ ابھی آ ہی رہا تھا کہ اُسے دیکھ کر وہاں کے امیر جماعت نے مجھے کہا کہ فلاں شخص آ رہا ہے اور وہ بڑا بدگو ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ آپ کی کوئی بے ادبی کر بیٹھے۔ میں نے کہا گھبراؤ نہیں۔ مجھے پتا ہے کہ اُسے کسی زمانہ میں میرے ساتھ بڑی محبت ہوا کرتی تھی۔ اس لیے یہ بے ادبی نہیں کر سکتا۔ بہرحال وہ صحن میں داخل ہوا۔صحن سے برآمدہ میں آیا اور برآمدہ سے آگے کمرہ میں داخل ہوا۔ اندر میں بیٹھا ہوا تھا۔ جونہی اُس نے میری طرف نظر اُٹھائی اور اِدھر میری نظر اُس پر پڑی تو یکدم اُس کی آنکھوں میں سے آنسو بہنے لگ گئے۔ میں نے کہا لو! تم تو کہتے تھے یہ بے ادبی نہ کر بیٹھے، اور اِس پر تو دیکھتے ہی رِقّت طاری ہو گئی ہے۔غرض یہ تو دینی معاملہ ہے۔ دنیوی عشق جو بالکل جھوٹا اور ناپائیدار ہوتا ہے اُس کے متعلق بھی شاعر کہتے ہیں

جب آنکھیں چار ہوتی ہیں مروت آ ہی جاتی ہے

آخر یہ لوگ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی صحبت میں بیٹھے ہیں اور انہوں نے آپ کی خدمتیں کی ہیں۔ اِن کو اور ان کی اولادوں کو بچانا اور پھر اُن کے اندر محبتِ دیرینہ کے جذبات کو زندہ کرنا، یہ بھی تو ہمارا ہی فرض ہے۔ اگر تم انہی لوگوں کو سنبھال لو تو لاہور میں ہماری جماعت کئی گُنا طاقتور ہو جائے۔

میں نے ایک دفعہ رؤیا میں دیکھا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کسی جگہ تشریف رکھتے ہیں اور آپ کے اردگرد اَور بھی بہت سے لوگ بیٹھے ہیں۔اُن میں سے بعض غیرمبائع بھی ہیں جن پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام ناراض ہیں۔ انہی لوگوں میں مَیں نے شیخ رحمت اللہ صاحب کو بھی دیکھا مگر میں نے دیکھا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام بات کرتے کرتے جب

شیخ رحمت اللہ صاحب پر نظر ڈالتے تو جھٹ اپنی آنکھیں نیچی کر لیتے اور محبت کی جھلک اُن میں دکھائی دینے لگتی۔

پس اللہ تعالیٰ یہ تو چاہتا ہے کہ یہ لوگ ہدایت پا جائیں مگر یہ نہیں چاہتا کہ یہ تباہ ہو جائیں۔ غلطی اَور ہوتی ہے اور غضب اَور چیز ہے۔ ہر غلطی کے نتیجہ میں غضب پیدا نہیں ہوتا۔ تمہارے بچے کئی غلطیاں کرتے ہیں مگر تمہیں اُن کی ہر غلطی پر غصہ نہیں آتا اور جب غصہ بھی آتا ہے تو وہ مرکب ہوتا ہے یعنی اُس غصہ کے ساتھ محبت بھی شامل ہوتی ہے۔ خالص غصہ اپنے پیارے پر کبھی نہیں آیا کرتا۔

ایک دفعہ بچپن میں مجھے خیال پیدا ہوا کہ لیکھرام کا ردّ براہین کا جواب لکھنا چاہیے۔ اُس نے کسی جگہ قرآن کریم کی بعض آیتوں پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہ متضاد خیالات ہیں۔ یا تو انسان کو غصہ آئے گا اور یا محبت پیدا ہو گی۔ غصہ اور محبت اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ بچپن میں مجھے مرغیاں پالنے کا بہت شوق تھا۔ اِس وجہ سے مرغیوں کی کیفیتیں مجھے خوب یاد تھیں۔ میں نے جواب میں لکھا کہ تم کہتے ہو ایک وقت میں محبت اور غصہ جمع نہیں ہو سکتے۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ مرغی اپنے بچوں کو لیے پھرتی ہے کہ اچانک چیل حملہ کر دیتی ہے۔ وہ اُس کے مقابلہ کے لیے ایک طرف غصہ میں کُودتی ہے اور دوسری طرف اپنے ایک پَر کو اپنے بچوں پر پھیلا دیتی ہے۔ اِس طرح ایک ہی وقت میں اُسے غصہ بھی آ رہا ہوتا ہے اور اُس کے اندر محبت بھی پیدا ہو رہی ہوتی ہے۔

پس یہ غلط بات ہے کہ ایک وقت میں یہ دونوں جذبات اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ اِسی طرح جب کسی شخص کے ساتھ دیرینہ تعلق ہوتا ہے تو اُس کی باتوں پر خالص غصہ کبھی نہیں آتا۔ محبت کا جذبہ بھی اُس کے ساتھ شامل ہوتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب کوئی گنہگار بندہ اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کرتا ہے تو اُس کی اِس توبہ پر اللہ تعالیٰ کو اُس ماں سے بھی زیادہ خوشی ہوتی ہے جس کا کھویا ہوا بچہ اُسے مل جائے۔

یہی کیفیت انسانی قلوب کی بھی ہونی چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں اِس بارہ میں ہم پر پہلا حق اُن لوگوں کا ہے جو غیر مبائع ہیں اور دوسرا حق اُن لوگوں کا ہے جن کو ہم غیر احمدی

کہتے ہیں کیونکہ ہمارا روحانی باپ ایک ہی ہے۔ وہ اگر غصہ میں آگے نکل جائیں تو یہ اُن کا اپنا قصور ہے۔ ہمیں بہرحال اُن کے لیے محبت اور پیار کے جذبات ہی اپنے دل میں رکھنے چاہییں اور اُنہیں اپنے ساتھ شامل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر تم اِس کام میں کامیاب ہو جاؤ تو غیر مذاہب والوں کو بھی آسانی سے اسلام کی طرف کھینچ سکو گے''۔

(الفضل 13 دسمبر 1961ء + غیر مطبوعہ مواد از خلافت لائبریری ربوہ)

---

1 : تاریخ الطبری جلد 3 صفحہ 260 ثم دخلت سنة سِتّیْن۔ بیروت لبنان 1971ء۔

2 : مسند احمد بن حنبلؒ مترجم مسند ابی ھریرةؓ جلد 4 صفحہ 19 حدیث نمبر 7180 مکتبہ رحمانیہ لاہور

3 : صحیح البخاری کتاب فضائل اصحاب النبیؐ باب قول النبیؐ سُدُّو الابوابَ اِلّاباب اَبی بکرٍ

4 : تذکرہ صفحہ 402۔ایڈیشن چہارم

5 : درثمین (اردو) زیرعنوان ''بشیر احمد، شریف احمد اور مبارکہ کی آمین''۔ صفحہ 42 مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی 1962ء

6 : درثمین (اردو) زیرعنوان ''محمود کی آمین''۔ صفحہ 30۔مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی 1962ء